ایک پروگرام اپنے ذہن میں طے کرلیتا ہے تو پھر اس سے بال برابر انحراف نہیں کرتا۔ رات ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ صبح سویرے جھیل سیف الملوک چلیں گے اور سارا دن وہاں گزار کر شام کے وقت واپس ناران آئیں گے۔ آنے جانے کا بندوبست، دن بھر کا راشن پانی اور دوسری ضرورت کی چیزوں کا اہتمام اس کے ذمے تھا۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ ان ساری چیزوں کا بندوبست رات کو سونے سے پہلے کرکے سوئے گا اور ہمیں اتنی جلدی جگانے آجائے گا۔ ہمیں اس کا بے وقت آنا بہت بُرا معلوم ہُوا۔ خاص طور پر عماد اور مسعود کو جو فجر پڑھنے کے بعد پھر لحافوں میں دبک کر سو گئے تھے۔ لیڈر کی سوٹی کے ٹھوکروں سے مُفتی بھنّا اُٹھا اور جل کر بولا "حرامزادے، پہلے نوجوانوں کو اُٹھا پھر مجھے جگا — یہ کیا کہ سب سے پہلے میرے سر پر ہی ٹاپ کرنے لگ گیا ہے"۔

"وہ اُٹھتے نہیں" — عمر نے چیخ کر کہا — "تم تو سیانے بیانے آدمی ہو۔ تم تو اُٹھو"۔

"میرا تو ابھی سونا نمبر ایک ہی ختم نہیں ہُوا اور تم اُسی کی جان کے دشمن ہو گئے ہو۔ ابھی تو مجھے سونا نمبر دو شروع کرنا ہے"۔

مُفتی کی ایک نرالی عادت ہے۔ وہ جس کمرے میں جس بستر پر سوتا ہے صبح چار پانچ بجے وہاں سے اُٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے اور وہاں جاکر پھر سو جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا سونا نمبر دو فرش پر ہوتا ہے اور اگر فرش پر قالین یا دری وغیرہ نہ بچھی ہو تو وہ دوسرے کمرے میں ٹرنکوں پر، میز پر یا کرسیوں پر جاکر سو جاتا ہے۔ پھر وہ دن چڑھے بیدار ہوتا ہے اور ننگے پاؤں ہر کمرے میں، ہر برآمدے میں گھومتا رہتا ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ اُسے چائے کا ایک بڑا مگ نہ مل جائے۔ چائے پینے کے بعد اُسے اپنے اردگرد کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ خواب کی وادی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتا ہے۔ اگر اس کی یہ ڈرل پُوری نہ ہو، تو سارا دن بیزار، بے چین اور تنگ دل رہتا ہے۔

اتنے میں گونگا پراٹھوں اور انڈوں کی ٹرے لے کر آگیا۔ لیڈر کا حکم تھا کہ پہلے کُلی کرکے ناشتہ کرلو، اس کے بعد مُنہ ہاتھ دھونا اور شیو وغیرہ کرنا۔ ہم سب نے ہاتھ دھونے اور شیو کرنے کو ناشتے

پر ترجیح دی اور اپنے اپنے بستروں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیڈر سے کہا ابھی چائے نہ بنوائے اور ہماری کٹیوں کا معائنہ کر لے کہ ان میں جھیل سیف الملوک تک جانے کی تمام چیزیں ٹھیک ہیں یا نہیں۔ لیڈر ہماری کٹیوں کا معائنہ کرنے چلا گیا اور ہم شیو کرنے لگے۔ جب مرد جوان ہوتا ہے تو اس کی شیو میں سب کو دلچسپی ہوتی ہے۔ خود اس کو بھی حجامت بنانے میں مزہ آتا ہے۔ بلیڈ، سیفٹی، گرم پانی کا مگ، خوشبودار صابن، برش، سہاگ رات کے بعد عورت کو سب سے پیاری چیز مرد کا شیو کرنا لگتی ہے۔ دلہن خواہ جاگ رہی ہو یا سوئی ہوئی ہو دولہا کبھی بھی غسل خانے میں شیو نہیں کرتا، اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس چھوٹی میز لگا کر شیو بناتا ہے اور اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتا جاتا ہے۔ مرد کو اپنے ذاتی استعمال کے سامان میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ عورت کو دوسروں کو دکھانے کے سامان میں آنند آتا ہے۔

جب تک عورت مرد کا سامان رہتی ہے وہ اس پر جان چھڑکے جاتا ہے، اس کے لئے حلال ہوتا رہتا ہے۔ جب وہ آزاد اور خود مختار ہو جاتی ہے تو مرد اس کی ایک آزاد اور خود مختار فرد کی حیثیت سے عزت کرنے لگتا ہے اور دونوں کے درمیان باہمی اُلفت کے بجائے تعظیم کا جذبہ کارفرما ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے شیو کا سامان ان کی بیویاں پیک کر کے رکھتی ہیں، کچھ کے اردلی اور ملازم یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ باقی کے خود اپنا سامان دھو کر رکھتے ہیں اور کچھ انہیں اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں، اگلے دن کے لئے۔ بڑی عمر کا آدمی اکیلا اپنی شیو کرتا ہے۔ اس کے برش پکڑنے اور سیفٹی چلانے میں کوئی خوبصورتی نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے پر صابن کا جھاگ نہیں اُٹھتا۔ ہلکے نیلے رنگ کا پھٹکی دار پانی سا پھٹتا رہتا ہے جو کشش ثقل سے موٹے موٹے قطروں کی صورت میں نیچے بھی گرتا رہتا ہے۔ اسے اپنی کھال ایک طرف سے پکڑ کر سیفٹی چلانی پڑتی ہے اور ماس کو بار بار تر کرنا پڑتا ہے۔ ہم سب چونکہ بڑی عمر کے لوگ تھے اس لئے ایک دوسرے سے دُور دُور کوئی پتھر پر، کوئی دروازے کی دہلیز پر، کوئی کھڑے ہو کر اور کوئی کرسی پر بیٹھ کر شیو کر رہے تھے اور ہماری ٹھوڑیوں سے نیلگوں قطرے ٹپک رہے تھے۔

اب ناران کی سب سے بلند چوٹی کے پیچھے سے سورج نکل آیا تھا اور ہم اپنی اپنی کٹ

کندھوں پر اُٹھائے، چھڑیاں ہاتھوں میں پکڑے بازار سے گزر رہے تھے جہاں گھڑی سازوں کی بہت سی دُکانیں تھیں۔ لیڈر ہم سب سے آگے تھا اور اس کی پیٹھ پر سب سے زیادہ بوجھ لدا ہُوا تھا۔ مُفتی چونکہ ستر سال کا تھا اس لئے قطار میں سب سے پیچھے تھا۔ ہم پتھروں کے سَروں پر پاؤں رکھتے، چھڑیوں سے دوسرے پتھروں کو ٹھکورتے جھیل سیف الملوک کی طرف رواں تھے اور ہمارے سامنے سات میل لمبا رستہ اور ڈھائی ہزار فٹ کی چڑھائی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جب ہم فارسٹ ریسٹ ہاؤس والا موڑ مڑ کر اخروٹوں کی چھاؤں میں چلنے لگے تو دو راہگیروں نے ہمیں روک کر پُوچھا۔ "کِدھر کے ارادے ہیں صاحب"؟

"جھیل سیف الملوک کے"۔

"پیدل"!

"جی جناب"۔

"پہلے بھی کبھی گئے ہیں پیدل"؟

"نہیں جناب، پہلا موقع ہے"۔

"واپسی مشکل ہے"۔ ایک نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کیوں؟" — عماد نے پُوچھا۔

"میدانی لوگ اتنی چڑھائی نہیں چڑھ سکتے صاحب"۔

سامنے سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان آ رہا تھا۔ اس کے سَر پر سندھی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں بکری کی رسّی تھی جسے اس نے کان سے پکڑا ہُوا تھا۔ وہ بھی باتوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ سفید ڈاڑھی والے نے بتایا کہ یہ لوگ لاہور اور راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور پیدل سیف الملوک جا رہے ہیں۔ سندھی ٹوپی والا ہنسا اور پتھر پر تھوک کر بولا۔ "ہفتہ دس دن ہوئے ایک فوجی کپتان نے بھی کوشش کی تھی۔ بڑا خوبصورت جوان تھا، لیکن جب سیدوں کے بنگلوں سے اُوپر گیا اور پہلی لمبی چڑھائی چڑھی، تو ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا اور دم دے دیا"!

"کیوں"؟ — مسعود نے پُوچھا۔

"کلیجہ پھٹ گیا اور کیوں؟ سالم جیپ کرا کے اس کی لاش بالاکوٹ لے جائی گئی اور پھر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اس کو دفن کیا گیا۔ آپ کی پنڈی کا تھا۔"

"سُن لو مُفتی"۔۔۔ مسعود نے ہنس کر کہا۔۔۔ "تمہارا دل بھی کمزور ہے اور دو دفعہ ہسپتال بھی ہو آئے ہو۔ سالم جیپ کرانی پڑے گی۔"

"کتنے پیسے لگیں گے؟"۔۔۔ مُفتی نے پوچھا۔

"سو روپے"۔۔۔ سندھی ٹوپی اور بکری کی سری والے نے جواب دیا۔

"سو میرے پاس ہے یارو۔ پتلون کی چھوٹی جیب میں۔ فکر نہ کرنا اور چندہ جمع کرنے نہ بیٹھ جانا۔"

مُفتی نے آرام سے کہا اور ان تینوں کے ساتھ باری باری پُرتپاک مصافحہ کر کے آگے چلنے لگا۔ عُمر ان لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ یہاں قبر کھُدوانے پر کتنی لاگت آتی ہے اور وہ لوگ بتا رہے تھے کہ قبر تو قصبے کے لوگ مل ملا کر مُفت ہی کھود دیتے ہیں لیکن جگہ تلاش کرنے میں ذرا دِقت ہوتی ہے۔ عماد پوچھ رہا تھا کہ یہاں قبروں کے تعویذ لکڑی کے کیوں بناتے ہیں اور وہ بتا رہے تھے کہ اخروٹ عام ہوتا ہے اس لئے سستا پڑتا ہے اندر پتھر ہوتے ہیں اور اُوپر اخروٹ کی لکڑی کا بکسا۔ قبر خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ مُفتی چونکہ ان باتوں میں شریک نہیں ہُوا تھا اس لئے ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اب وہ ہمارا لیڈر تھا اور ہم قطار کی صُورت میں اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ راستے میں عُمر نے ہم سب کو روک کر کہا۔۔۔ "یار مُفتی کو مناؤ وہ نہ جائے۔ وہ ہارٹ کا مریض ہے اور اس کو دو مرتبہ اٹیک ہو چکا ہے"۔۔۔ مسعود کہہ رہا تھا۔ "جب اس کی دوائیاں ساتھ ہیں تو پھر زیادہ فکر کرنا مناسب نہیں"۔۔۔ اعظمی نے کہا۔۔۔ "لیڈر اپنی کِٹ اچھی طرح سے دیکھ لو کہ اس میں مُفتی کی دوائیاں ہیں بھی یا نہیں"۔۔۔ ہم نے پتھروں کی مینڈھ پر کِٹ کھول کر دیکھی اس میں مُفتی کی تینوں شیشیاں موجود تھیں اور مریض ہمارے خدشات کی پروا کئے بغیر بڑے آرام سے چڑھائی چڑھ رہا تھا۔

جھیل سیف الملوک کو جانے والا رستہ بڑا پتھریلا ہے۔ اس میں ہر ہر قدم پر ٹھوکر لگتی ہے اور ہر قدم اُونچا نیچا پڑتا ہے۔ ہم نے اپنا سفر شروع تو کر دیا تھا لیکن اس کے ختم ہونے کے بارے میں یقین سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ جوں جوں ہم ایک ایک فٹ، ایک ایک گز اُوپر کو اُٹھ

رہے تھے، دھوپ تیز ہو رہی تھی اور ہوا کمزور۔ چہرے پر اور گردن پر سوئیاں چبھنے لگی تھیں اور سانس کھینچنے میں دقت ہونے لگی تھی۔ قصبے سے کوئی ایک میل دُور نکل آنے کے بعد ہم نے پہلا پڑاؤ ایک جھگی کی اوٹ میں کیا جہاں تھوڑا سا سایہ تھا۔ سب نے اعظمی کے فولڈنگ گلاس سے کوہل کا ٹھنڈا پانی پیا اور ٹانگیں لمبی کر کے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ اعظمی اپنی چھڑی سے پتھروں پر سنگ ترنگ بجا رہا تھا اور مُفتی کی طرف کانی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ عماد اور عمر کی پرانی شرط چل رہی تھی کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر آدھ گھنٹے میں واپس آجاؤ اور دس روپے لے لو۔ عمر کہہ رہا تھا دس کم ہیں، بیس دو تو ابھی چلا جاتا ہوں اور اگر دس ہی دینے ہیں تو چوٹی ذرا چھوٹی کر دو۔ سامنے والی کے بجائے دوسری لے لو۔ یہ بائیں ہاتھ والی ــــ مسعود نے کہا ــــ "مُفتی جی، یہ پہاڑ اور میدان میں اور اونچان میں اور نیچان میں کچھ فرق ہے کہ بس نظر ہی کا دھوکا ہے؟"

مُفتی نے کہا ــــ "کمبل پوش سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضور آپ کے نزدیک کفر اور اسلام میں کچھ فرق ہے یا نہیں تو آپ نے کہا تھا، بھائی کچھ بھی نہیں۔ دونوں شانیں سرکاری ہیں۔ اندھیرے اُجالے کا سا حال ہے۔ سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے گرمی میں چھاؤں۔ دن کو روشنی اچھی لگتی ہے رات کو اندھیرا۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا کسی کو بھی علم نہیں ــــ پتہ نہیں یہ اونچائی نیچائی ایک سی ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے۔"

عماد جو مُفتی کی بات غور سے سُن رہا تھا، ٹوپی اُتار کر بولا ــــ "دونوں سرکاری شانیں ہیں مُفتی جی، فکر نہ کرو۔"

"فکر میں کرتا ہوں یا تیرا یہ کچھ لگتا مسعود کرتا ہے۔ مجھے کیا، مَیں کیوں فکر کروں۔"

عمر نے کہا ــــ "اوئے تلقین شاہ، تجھے یہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں معرفت کی؟"

"اس کو تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے" ــــ مسعود ہنس کر بولا ــــ "اور وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کیسے کمایا جا سکتا ہے اور کس طرح سنبھال کر رکھا جا سکتا ہے۔"

"ہاں سچ" ــــ عماد نے سنجیدگی سے کہا ــــ "آپ اس قدر لالچی اور پیسے کے پُتر کیوں ہیں؟"

مَیں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا ــــ "دراصل یہ خاصیت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور چونکہ مَیں نے اسے دُور کرنے کی کوشش نہیں کی اس لئے یہ اور بھی راسخ ہوتی گئی۔ اب میں حصولِ زر

کے چکر سے نکل نہیں سکتا۔"

"جب تمہیں اس بات کا اتنا احساس ہے تو پھر اس چکر سے نکل کیوں نہیں آتے ؟" — عمرؓ نے پوچھا۔

مَیں نے کہا ۔" احساس دو طرح کا ہوتا ہے ۔ ایک اکتسابی اور دوسرا جذباتی ۔ جب آدمی کو اکتسابی اور کتابی احساس ہوتا ہے تو وہ ہر مسئلے کا تجزیہ کر کے اسے اس طرح چھوڑ دیتا ہے اور جب اس کی پیش قدمی جذباتی ہوتی ہے تو وہ اس مسئلے کے حل کرنے کے لئے جدّ وجہد کرتا ہے اور عام طور پر کامیاب ہوتا ہے ۔ مَیں چونکہ حصولِ زر اور حلبِ منفعت کو کتابی طور پر بُرا سمجھتا ہوں جذباتی طور پر نہیں اس لئے اس چکر سے نکل نہیں سکتا۔"

"تو تم اس کو جذباتی مسئلہ بنا کر سوچا کرو ناں" — عمرؓ نے بھول پنے سے نصیحت کی اور مَیں نے اسی بھول پن کے ساتھ اس کی نصیحت پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا ۔ اتنے میں جھگی سے ایک آدمی اور اس کی نو دس سال کی لڑکی برآمد ہوئی ۔ وہ ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تو مسعود نے جیب سے دو لیمن ڈراپس نکال کر لڑکی کو دیئے ۔ آدمی نے پوچھا کہ ہم لوگ خدانخواستہ جھیل سیف الملوک دیکھنے تو نہیں جا رہے اور ہم نے بیک آواز کہا ۔" الحمدللہ وہیں جا رہے ہیں" — وہ بیچارہ کچھ فکر مند سا ہو گیا اور مُنہ لٹکا کر بولا ۔" پچھلے سال لاہور سے بی بیوں کا ایک قافلہ آیا تھا ۔ کوئی تیس پینتیس بیبیاں تھیں ۔ بہت خوبصورت اور بہت ہی اچھے کپڑوں والی ۔ ان کے ساتھ ان کی اُستانیاں اور مستیں بھی تھیں ۔ وہ بھی پیدل سیف الملوک جا رہی تھیں۔"

"پھر ؟" — عماد نے پوچھا۔

" آگے ایک اخروٹ کا درخت آئے گا ۔ آدھے راستے کے بعد کچی پہاڑی پر ۔ اس کے نیچے آپ کو ایک بڑا سا پتھر دکھائی دے گا ، آدھا کالا اور آدھا لال ۔ ایک بی بی نے جو اُن سب میں سے خوبصورت تھی اس پتھر پر بیٹھ کر اپنی چپلی کا فیتہ کسا اور بس وہیں ختم ہو گئی۔"

"کیا ہو گئی ؟" — عمر نے چیخ کر پوچھا۔

" مر گئی ؟" — چھوٹی لڑکی نے جواب دیا۔

"کیوں ؟" — عماد نے پوچھا۔

"بس جی اللہ کا حکم۔ جسم کا زور پڑا۔ خون نے گرمی کھائی۔ ٹھنڈی ہوا نے پٹا مارا اور نس پھٹ گئی۔"

"پھر؟" — عماد نے پوچھا۔

"پھر کیا جی، اس کو سالم جیپ کرا کے لے گئے۔ لاہور کی بی بی تھی بڑی خوبصورت۔"

"تم نے مری ہوئی دیکھی تھی؟" — عمر نے پوچھا۔

"ناں جی ہم نے تو نہیں دیکھی پہلے لوگوں سے سنا ہے۔"

"پہلے لوگوں سے؟" — مفتی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پہلے لوگ جو اس جھگی میں رہتے تھے۔ ہم سے پہلے۔"

اعظمی نے کہا — "اٹھو یارو، یہ تو سب کو سالم جیپ کرا دیتے ہیں۔ آئندہ کوئی آدمی ملا تو اس سے بات نہ کرنا۔"

"بالکل ٹھیک ہے جی" — اس آدمی نے کہا — "یہ پریوں کا علاقہ ہے، جب تک پہلے آدمی کو السلام علیکم کہو اور وہ وعلیکم السلام کہہ کر جواب نہ دے اس کے ساتھ بات نہیں کرنی چاہیئے۔"

"کیوں؟" عماد نے پوچھا۔

"وہ آدمی نہیں ہوتا جی، پری کا روپ ہوتا ہے، چڑیل ہوتی ہے۔"

"یار یہ پریاں اور چڑیلیں بھی بڑی دکھی مخلوق ہیں" — مفتی نے کہا — "مجھے ان لوگوں پر انسانوں سے بھی زیادہ ترس آتا ہے۔"

"لو شالا لوگ ترس کرنے کدھر چلا گیا" — اعظمی ہنس کر بولا۔

مفتی نے کہا — "غوث علی شاہ قلندر نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں ہم شاہ عبدالعزیز سے پڑھتے تھے تو ایک طالب علم تھا، نہایت پاکیزہ صورت اور موہنی مورت۔ اس کے پاس ایک چڑیل خوبصورت عورت بن کر آیا کرتی تھی اور دو روپے ہر رات کو دے جاتی تھی۔"

"دو روپے" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مسعود قہقہہ مار کر بولا — "اس کمبخت کو صرف دو روپے ہی نظر آئے اور وہ خوبصورت

عورت نظر نہ آئی جو ہر رات طالب علم کے پاس آتی تھی۔ لعنت ہو تیری کمرشل سوچ پر"۔
مُفتی نے جھلا کر کہا ۔"سُنو یارو۔ غور سے سُنو۔ وہ چڑیل خوبصورت عورت کے رُوپ میں تمام رات اس طالب علم کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک رات دونوں ایک چارپائی پر تھے اور چراغ کوئی پانچ چھ ہاتھ کے فاصلے پر طاق میں روشن تھا۔ طالب علم نے ایک عام مرد کی طرح اس سے کہا کہ جا چراغ گُل کر دے۔ اس عورت نے وہیں سے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر چراغ گُل کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر طالب علم سہم گیا اور ڈر کے مارے لرزنے لگا۔ عورت نے بہت کچھ تسلی تشفی اس بیچارے کی کی اور ہاتھ باندھ کر بولی۔ اے گلِ رعنا، مَیں تجھ پر عاشق ہوں اور تیری باندی ہوں۔ کسی قسم کا اندیشہ نہ کر، لڑکا چُپ چاپ اپنی جگہ خوفزدہ لیٹا رہا۔ جوں توں کر کے رات بسر کی اور صُبح کو یہ ماجرا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بیان کیا۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر اس کے بازو پر باندھ دیا۔ رات ہوئی تو وہ عورت حسبِ معمول پھر اس کی کوٹھڑی میں آئی مگر دُور کھڑی رہی اور رو کر کہنے لگی ۔ مَیں نے تیرے ساتھ کیا بُرائی کی جو تُو نے ایسا ظلم مجھ ستم رسیدہ پر ڈھایا۔ خدا کے لئے یہ تعویذ کھول ڈال اب میں چار روپے روز دیا کروں گی"۔
مسعُود نے زور کا نعرہ مارا اور چلا کر کہا ۔"سُنا شاہ جی ؟ چار روپے روز"! اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔
"پھر، پھر ؟"۔ عمر نے بے چین ہو کر پوچھا ۔" پھر مُفتی ؟"
"پھر کیا"۔ مُفتی نے کہا ۔" اس ظالم نے تعویذ کھولا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی"۔
"ایسا تعویذ ایک مرتبہ میری بیوی نے بھی کرایا تھا"۔ عمر نے آہستہ سے کہا۔
"لیکن اس نے کوئی خاص کاٹ نہیں کی"۔ اعظمی مسکرا کر بولا۔
"نہیں بھئی نہیں"۔ مسعُود نے چھڑی اُوپر اُٹھا کر کہا ۔" پرسنل بات نہیں۔ خاص طور پر لیڈر کے بارے میں تو کوئی بھی بات نہیں"!
پھر ہم اُٹھے اور منزل کی طرف چلنے لگے۔ راستہ جب پتھریلا ہو، سورج کی تمازت تیز ہو، ہر قدم پر چڑھائی ہو تو مسافت مشکل سے طے ہوتی ہے۔ ہم اپنے پاؤں پر تو مضبوط تھے، لیکن ہمیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لیڈر کا حکم تھا کہ چلتے رہو، چلتے رہو اور چلتے رہو۔

رکو گے تو مومینٹم ٹوٹ جائے گا اور تم لوگ کبھی بھی جھیل تک نہ پہنچ سکو گے۔ ہمارے پہلو سے دو نوجوان لڑکے ٹٹوؤں پر سوار گزرے۔ ان کے ساتھ پیدل گائیڈ تھے جو ان نوجوانوں کو جھیل دکھلانے لیے جا رہے تھے۔ مسعود نے حسرت بھری نظروں سے ٹٹوؤں کو دیکھا اور پھر گردن جھکا کر چلنے لگا۔ راستے میں پتھروں کے درمیان طرح طرح کے جنگلی پھول اُگے تھے جن میں سے تقریباً ہر ایک کو اعظمی جانتا تھا اور اس کی نسل کو پہچانتا تھا۔ اعظمی کو پھول جمع کرنے کا شوق ہے۔ تازہ رنگ برنگے، چھوٹے، بڑے، سوکھے، استری کیے ہوئے پھول۔ وہ بار بار جھک کر پتھروں کے درمیان سے کوئی پھول توڑتا۔ اس سے ایک آدھ بات کرتا اور پھر احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر اپنے تھیلے میں رکھ لیتا۔ اعظمی کا مزاج اپنی طرز کا نرالا ہے۔ اُسے قدرت نے لفظوں سے کھیلنا، ان کی صورت بدلنا، ان کے معنی الٹانا کچھ اسی طرح سے سکھایا ہے کہ اس کے سارے دوست اس کی اس خوبی کو خرابی سمجھنے لگے ہیں اور اس سے میٹھا میٹھا حسد رکھتے ہیں۔ وہ میری آپ کی طرح سے ایک چھوٹا انسان ہے اور چھوٹی چھوٹی بے شمار کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ ہماری طرح اس کا بھی ایک ہی منتہائے مقصود ہے۔ نوکری کرنا، بال بچوں کو پالنا، اگلی ترقی پر نگاہ رکھنا اور آخر میں ریٹائر ہو کر فوت ہو جانا۔ اس ساری نارمل اور صحت مند زندگی کے درمیان اسے ایک ہی مزمن مرض لاحق ہے اور وہ ہے پھولوں سے محبت کرنا۔ میں نے اعظمی کو پھولوں سے محبت کرتے زیادہ قریب سے نہیں دیکھا، لیکن مجھے یقین ہے وہ ان سے کافی پیار کرتا ہو گا۔ پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ، کیا مرد، کیا عورتیں، عام طور پر معمولی شکل و صورت کے ہوتے ہیں۔ وہ پھولوں کی خوشبو سے یا ان کی رنگت سے یا ان کی گھڑت سے پیار نہیں کرتے، ان کے ہونے سے پیار کرتے ہیں۔ ضلع شیخوپورہ کے ایک دُور افتادہ گاؤں کڑکن میں میں نے ایک نوجوان مصلن بیبو کو پھولوں سے پیار کرتے دیکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے کوارٹر کے صحن میں جھاڑو دیتے دیتے اچانک رک جاتی اور زمین پر گرے ہوئے کسی پھول کو اٹھا کر دیکھنے لگتی۔ دیکھنا اس کا عشق تھا۔ دیکھنا اس کا جذب تھا، مستی تھی اور وہ پھول کو دیکھتے دیکھتے ایک اور طرح کی مٹیار بن جاتی۔ بڑی قبول، بے حد
(مادہ Ova (Ovum
RECEPTIVE جیسے اووا اپنی جھالر سے ٹوٹ کر سپرم کی پذیرائی کے لیے ہوتا ہے۔ اس لڑکی کو بڑی گالیاں، بڑے دھوکے اور بڑی ٹھوکریں اور ٹھڈے سہنے پڑتے تھے کیونکہ وہ کام دھیان سے

نہیں کرتی تھی۔

مُفتی چلتے چلتے رک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنے بوٹ کے تسمے کھول کر اس میں سے کنکر نکالنے لگا۔ ہم سب اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ لیڈر کا حکم تھا کہ ہم میں سے کوئی بیٹھنے نہ پائے کیونکہ بدن گرم ہیں سانس مرتب ہیں اور ٹانگیں چلنت ہیں اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی رخنہ پڑ گیا تو ساری مہم دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پھر لیڈر نے مُفتی سے پوچھا کہ اس کا دل کس طرح سے چل رہا ہے۔ مُفتی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھا۔ عماد نے رائے دی کہ مُفتی جی کو ایک لال گولی اسی وقت دے دینی چاہیئے، لیکن مُفتی نہ مانا اور یہی کہتا رہا کہ جب ضرورت پڑے گی تو وہ خود مانگ لے گا۔ اس مختصر سے قیام کے بعد ہمارا قافلہ پھر آگے چلنے لگا۔

مکئی کے چھوٹے بڑے کھیتوں کی مینڈھیں کاٹتے ہوئے جب ہم ایک ایسے راستے پر آئے جو نسبتاً کم پتھریلا تھا اور جس کی پگڈنڈی کے نیچے کچی مٹی بھی دکھائی دیتی تھی تو ہماری جان میں جان آئی۔ پیچھے سے دو گوالوں نے ہمارے قریب آ کر سر نکالا اور زور سے السلام علیکم کہا۔ ہم سب نے باجماعت ان کے سلام کا جواب دیا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کے خالی برتن تھے اور سروں پر ساگ کی گٹھڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا — "ہم نے ناران کے بازار میں لوگوں کو باتیں کرتے سُنا ہے کہ ایک ستر سال کا بڈھا پیدل جھیل سیف الملوک دیکھنے جا رہا ہے"

مُفتی نے رُک کر کہا — "وہ بڈھا میں ہوں۔ کر لو کیا کر سکتے ہو؟"

دوسرے نے کہا — "آپ کے مُنہ پر خون چڑھ آیا ہے۔ اس ارادے سے باز آ جائیں۔ نہیں تو کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

مُفتی بولا — "یہ کلیجہ پہلے بھی تین مرتبہ پھٹ چکا ہے۔ ایک مرتبہ بٹالے میں۔ پھر قصور میں اور حال ہی میں لاہور میں۔"

"لاہور میں دھرمپورے کے اندر پھٹا تھا" — اعظمی نے ہنس کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا "کیا نام تھا اس کا شاہ جی؟"

"عالم بی بی۔"

"عالم بی بی کون ہے؟" — عماد نے پُوچھا۔

"یہ نمازیوں کے سُننے کی بات نہیں" — مُفتی نے جواب دیا۔ "یہ بے نمازیوں کی وارداتیں ہیں۔"

دونوں گُوالے ہماری باتوں سے بیزار ہو کر جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگے اور دیکھتے دیکھتے اپنے برتنوں اور گٹھڑیوں سمیت پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اب اخروٹ کا وہ درخت قریب آ رہا تھا جہاں لاہور کی ایک خوبصورت طالبہ نے دم توڑا تھا اور اس کی لاش سالم جیپ میں گھر واپس گئی تھی۔ ہم سب چور نگاہوں سے اخروٹ کے اس تناور درخت کو دیکھ رہے تھے جس کے نیچے خانہ بدوشوں کا ایک چھوٹا سا کُنبہ بیٹھا تھا اور ان کے پہلو میں سیاہ رنگ کا ایک کُتا بڑے زور سے بھونک رہا تھا۔ مسعُود نے گردن گھُما کر اُدھر دیکھا اور پھر بڈھے بیل کی طرح سر ڈال کر لمبے لمبے قدم اُٹھانے لگا۔ عماد چونکہ سائنس کا طالب علم ہے اور اس کو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی بات کا علم ہے اس لئے وہ چلنے اور رکنے کی سائنس سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اسی نے ہم سب کو یہ رائے دی تھی کہ چلنے میں ایک ردم ہونا چاہیئے۔ جس تال پر قدم اُٹھاؤ اسی پر اُٹھاتے چلے جاؤ۔ اگر اکھڑے یا بے تالے ہوئے تو جلد تھک جاؤ گے اور کبھی اپنی منزل کو نہ پہنچ سکو گے۔ اس کے کہنے کے مطابق میں اور مسعُود دل ہی دل میں اپنی چال کے ماترے گنتے جاتے تھے اور ٹھیک جا رہے تھے۔ عمر چونکہ پہاڑی آدمی ہے اور اُس کا بچپن اور جوانی دھرم سالے میں گزری ہے اِس لئے اُس کو چلنے میں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اعظمی کچھ ایسا بے معنز اُونٹ ہے کہ اُس کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ مسافت طے کر رہا ہے۔ چلنے کے معاملے میں اگر کوئی تکلیف میں مبتلا تھا تو وہ عماد تھا۔ ایک تو اُس کے قدم تال سے باہر پڑ رہے تھے دوسرے بلندی پر آ جانے کی وجہ سے اس کا سَر گھوم رہا تھا اور اُسے ہلکی ہلکی ابکائیاں آ رہی تھیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہر بڑے سائنس دان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ زمین کی زندگی بڑے لوگوں کے لئے بڑی مشکلیں پیدا کر دیتی ہے۔

سامنے سے کچھ لوگ کدالیں اور پھاوڑے لے کر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ سلک کی قمیص پہنے ایک موٹا سا میٹ بھی تھا۔ یہ مزدوروں کی پہلی بیٹ تھی جو راستے کا گلیشیر کاٹ کر

آرہی تھی۔ انہوں نے ہمیں روک کر ہم سے سگریٹ مانگے اور ہمیں یہ مشورہ دیا کہ یہیں سے واپس چلے جائیں کیونکہ جھیل ابھی بہت دُور تھی اور شام پڑنے تک ہم بمشکل تمام وہاں پہنچ سکتے تھے۔ میٹ نے کہا ــ "پرسوں تک جیپ چلنی شروع ہوجائے گی اور شہری لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف نہ ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ بھی پرسوں تک انتظار کریں اور اپنی جان مشقت میں نہ ڈالیں۔"

ہم نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے چل پڑے۔ آگے چلنا، آگے بڑھنا اور مسلسل چلتے رہنا اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہر وقت منزل پر نگاہ رکھنی اور جدّوجُہد کے ساتھ زندہ رہنا زندہ لوگوں اور زندہ قوموں کا کام ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ پِس جاتا ہے، مر جاتا ہے، ختم ہوجاتا ہے۔ بلندی بلندی بلندی۔ شہرت شہرت۔ عزّت عزّت عزّت، لیکن آگے بڑھنے، ہر وقت جدّوجُہد کرنے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی کوئی حد نہیں۔ اگر ایک ڈاکٹر ہو، ایک معمولی سا ایم بی بی ایس ساہیوال کا رہنے والا، جاٹوں کا لڑکا، معمولی گھرانے کا فرزند اور وہ ترقی کرنے لگے اور ترقی کرتا کرتا انگلستان پہنچ جائے اور سرجری میں اپنے کمالات دکھا کر رائل سوسائٹی آف سرجنز کا فیلو بن جائے اور اس کی تحقیقات دنیا کی سات زبانوں میں ترجمہ ہوکر سارے عالم میں پھیل جائیں اور اس کے لئے اعزازی ڈگریوں کے بند دروازے آپ سے آپ کھلنے لگیں اور اُسے ہر ملک اپنے یہاں رہنے کی دعوت دے اور اُسے واشنگٹن ڈی سی سے اس لڑکی کا خط ملے جس نے ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں اس سے بدتمیزی کی تھی اور ڈنر پر کہا تھا ــ "ڈاکٹر صاحب آپ کچھ زیادہ ہی بور ہیں۔ آپ مجھے امپریس نہیں کرسکتے" ــ اور یہ بات اس کے دل میں گرہ بن کر بیٹھ جائے اور اُس نے اس گرہ کو کھولنے کے لئے مسلسل جدّوجُہد مسلسل کوشش اور لگاتار محنت کی ہو اور اس محنت کے صلے میں اُسے دنیائے طب میں وہ مقام ملا ہو جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور پھر واشنگٹن ڈی سی کے ڈپلومیٹک سروس کے بڑے صاحب کی اس لڑکی سے اس کی شادی ہوجائے اور اس شادی پر چند غیر ملکی ڈاکٹر بھی کراچی آئیں اور اس شادی میں شریک ہوں تو کتنا بڑا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور نوجوان کی کیسی دیرینہ آرزو پوری ہو۔

پھر وہ ہاکس بے کے ہٹ میں ہنی مون منائیں۔ گھوڑا ڈاکا، خانس پور اور ایوبیہ میں ایک ساتھ ایک مہینہ گزاریں، لندن، پیرس اور روم کے ہوٹلوں میں اپنی رنگین، خوشگوار اور پائیدار ازدواجی زندگی کے پروگرام بنائیں۔ اپنے بچوں کے نام پہلے سے سوچیں۔ لڑکی ہر رجسٹر میں دستخط کرتے وقت اپنے نئے نام کے نئے لفظ کو اُجاگر کر کے لکھے، تو خوشی، شادمانی اور کامیابی کے کیسے کیسے شادیانے بجیں اور جب ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہو اور زچہ بچہ ہسپتال سے گھر آئیں اور کوٹھی کے تینوں بڑے لانوں میں تین بڑے تنبو تانے جائیں اور پولیس بینڈ بجے، تو محنت اور مسلسل جدوجہد اور کامیابی اور کامرانی کیسے کیسے رنگ برنگے جوڑے پہن کر ان تنبوؤں کے درمیان اور قناتوں کے ساتھ ساتھ چکر لگائیں۔

جب ڈاکٹر کے آفٹر شیو لوشن کی خوشبو اور اس کی بیوی کے مینا رپچی کی نکہت ایک ساتھ بچے کے گالوں میں رچنے لگے تو زندگی کس کس طرح ان کی کوٹھی کے دروازے اور دریچوں میں جھولا جھولے اور پھر جب ایک دن اس لڑکی کا ایک کزن بھارت کے جنگی کیمپ سے رہا ہو کر کراچی اپنی کزن سے ملنے جائے اور ڈاکٹر کا کیپٹن سے پہلی مرتبہ تعارف ہو اور تینوں لان میں بیٹھ کر چائے پئیں اور جنگی کیمپوں کے حالات سُنیں اور تنہائی، اُداسی اور دُوری کے قصے بیان کریں اور رات کے وقت کیپٹن اپنے کمرے میں کھڑکی کھول کر وائلن بجائے اور سمندر کی لہریں اس میں آنسو بھریں اور مسلسل جدوجہد اور کش مکش اور کوشش کا لکڑہارا اپنے تکیے پر سر رکھ کر سو جائے اور اس کی بیوی وائلن کی آواز سُنتی رہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے کانوں میں گرنے لگیں اور ساتھ کے کمرے میں جا کر وہ اپنے بچے کو دیر تک دیکھتی رہے اور پھر مٹھی بھر آیا کو کمبل اُڑھا کر واپس اپنے بستر میں آ کر لیٹ جائے تو کیا ہو اور اگر مسلسل جدوجہد کرنے والا محنتی، زندہ اور اولوالعزم ڈاکٹر بقیہ عمر اپنی بیوی کے آنسو پونچھتا رہے اور اس کا کوئی علاج نہ کر سکے تو کیا ہو! اور اگر وہ کیپٹن نوکری چھوڑ دے، اور شادی کرانے سے انکار کر دے اور پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہو کر لیاری کوارٹرز میں رہنے لگے تو کون روکے! اور اگر ڈاکٹر اپنی بیوی کو علاج کی غرض سے ولایت لے جائے اور اس کا علاج نہ ہو سکے تو پھر کون سے ستارے پر کمند ڈالے؟ لیکن ہر وقت اپنی منزل پر نگاہ رکھنا اور جدوجہد کے ساتھ زندہ رہنا، زندہ لوگوں

اور زندہ قوموں کا کام ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ پس جاتا ہے، مر جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔

ہماری نگاہیں اپنی منزل کی طرف تھیں اور ہم ایک زندہ قوم کے روپ میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم کُل چھ تھے اور چھ کے چھ ایک ساتھ چل رہے تھے اگر ہم پانچ ہوتے یا اس سے بھی کم ہوتے تو بھی اسی طرح چلتے۔ تعداد کارکردگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ نہ کارکردگی سے کوئی متاثر ہوتا ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے، ایک لمحے کی بات ہوتی ہے جب اثر کا جالا مؤثر بن جاتا ہے۔ اس وقت نہ کبوتر کی کوئی خوبی تھی نہ نورجہاں کی، نہ شہزادہ سلیم کی۔ ایک لمحہ تھا جو اپنا کام کر گیا اور پھر سالوں اور مہینوں پر محیط ہو گیا۔

مسعود نے چیخ کر کہا — "شاہ جی پھر واپس پہنچ گئے لاہور"؟

مَیں نے دھیمی آواز میں کہا — "نہیں یار مَیں تو تمہارے ساتھ ہوں"۔

"اس کو مارو" — مُفتی نے رُک کر کہا — "گنتی میں ہم چھ ہیں لیکن اصل میں پانچ ہیں۔ یہ سالا ہر وقت غائب رہتا ہے"۔

"حاضر سائیں حاضر" — مَیں نے جواب دیا اور پھر ہم چلنے لگے۔ دراصل سانس پھول جانے کے باعث ہم زیادہ باتیں نہیں کر سکتے تھے اور مومینٹم پر اثر پڑنے کی وجہ سے رُک بھی نہ سکتے تھے۔

دور سامنے مزدوروں کی دوسری بیٹ گلیشئر کاٹ رہی تھی اور ہمیں ان کے پھاوڑے اُوپر اُٹھتے اور نیچے گرتے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔

عُمر نے کہا — "عماد بتا گلیشئر یہاں سے کتنی دُور ہے"؟

"گلیشئر"؟ — عماد نے ایک آنکھ میچ کر کہا — "یہاں سے؟ بس ہو گا کوئی ڈیڑھ میل دُور"۔

"ٹھیک ہے" — عمر نے تسلیم کیا اور سوٹی ہوا میں لہرا دی۔

اعظمی نے کہا — "لوشالا لوگ کوئی شرط ہی نہیں لگائی۔ اُس نے ڈیڑھ میل کہا۔ اُس نے مان لیا"۔

"ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے" — مسعود بولا — "اب یہ جھیل تک کوئی شرط نہیں لگائیں گے"۔

"سمجھوتہ بھی بڑے کام کی چیز ہے"۔۔۔ مُفتی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ "جب سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو آدمی سُکھی ہو جاتا ہے"۔

"نہیں مُفتی جی"۔۔۔ مسعود نے اپنی ہکلاہٹ کے ساتھ کہا۔۔۔ "سمجھوتے میں زبردستی کا ایل منٹ ہوتا ہے۔ مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی۔ سب کچھ جانتے ہوئے سمجھوتہ کرنا بڑا کربناک ہے"۔

"اور میرا بابا کہتا ہے"۔۔۔ مَیں نے اُونچی آواز میں کہا۔۔۔ "کہ ماننے کے لئے جاننا ضروری نہیں"۔

"واہ واہ"۔۔۔ مسعود نے نعرہ لگایا۔۔۔ "اپنے بابے کی باتیں سُنا"۔

مَیں نے کہا۔۔۔ "اِس وقت سانس پھُولی ہوئی ہے کہیں بیٹھیں گے تو بات کریں گے"۔

ہم پھُولی ہوئی سانسوں اور دُکھی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور گلیشیئر ہم سے دُور ہوتا رہا۔ راستہ سُنسان تھا اور چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ خاموشی کی بھی ایک اپنی آواز ہوتی ہے۔ ایک اپنی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک اپنا ہی پیٹرن ہوتا ہے۔ مَیں نے ایک زمانے میں مختلف خاموشیاں ریکارڈ کی تھیں۔ رات کے ایک بجے مقبرۂ نور جہاں کے باہر پانچ منٹ کی خاموشی ریکارڈ کی تھی۔ پھر آدھی رات کو سمن آباد کی ڈونگی گراؤنڈ کی خاموشی ریکارڈ کی تھی۔ پھر چولستان میں آدھی رات کا سناٹا ریکارڈ کیا تھا۔ یہ تینوں ریکارڈیں میرے پاس موجود ہیں اور مَیں نے انہیں کئی لوگوں کو سُنوایا ہے۔ ایک جگہ کی خاموشی دوسری جگہ سے مختلف ہے۔ جب ایک نہایت ہی خاموش جگہ میں آدمی تین گھنٹے تک مسلسل بیٹھا رہے تو ابتدا میں اس پر بڑی خوشگوار کیفیات گزرتی ہیں۔ پھر دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ نبض چلنے اور رگوں کے پھڑکنے کی آواز شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ صدائیں اتنی بلند ہو جاتی ہیں کہ "کانوں" کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور اندر باہر بیشمار ڈھول بجنے لگتے ہیں۔ اتنی اُونچی آواز آتی ہے کہ آدمی سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ مضطرب ہو کر سناٹے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور ان آوازوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے جو اس کے معمول میں داخل ہوتی ہیں۔ سناٹا اور خاموشی بڑا عذاب ہے اور یوگی لوگ بڑی مُشکل سے اِن

پر قابو پاتے ہیں۔

ہمارے دائیں ہاتھ اُونچے اُونچے پہاڑ تھے اور ان پر چھدرے چھدرے درخت اُگے تھے۔ کہیں کہیں اکا دُکا جھونپڑے بھی تھے۔ کبھی کبھار ان کے پاس چرتی ہوئی بکریاں بھی نظر آ جاتی تھیں، لیکن اس ویرانے میں سوائے ہم چھ کے اور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے اور اتنی لمبی مسافت طے کرتے ہوئے ہم سب کی شکلیں مختلف ہو گئی تھیں اور کانوں کے نیچے جبڑوں کے پاس جلد کھچ گئی تھی۔ اُوپر کی جھُریاں نیچے کی جھُریوں سے آملی تھیں اور آنکھیں چھوٹی ہو گئی تھیں۔ مسلسل ہانپنے اور مستقل زور لگاتے رہنے کی وجہ سے ہمارے پھیپھڑے، دل، جگر اور انتڑیوں کا کچھ حصّہ جسموں سے باہر آگیا تھا اور ہماری کمروں اور پیٹوں کے اِرد گرد لٹک گیا تھا۔ جب ہم چلتے تھے تو باہر لٹکے ہوئے دل، جگر، پھیپھڑے اور انتڑیاں ہمارے وجود سے ٹکرا رہی تھیں اور ان پر راستے کی دھول جم رہی تھی۔ یہ جسمانی تکلیف کچھ کچھ اس تکلیف سے ملتی تھی جب سلمیٰ باجی ہمارے قصبے سے گاڑی میں سوار ہوئی تھیں اور میں کچی چھت پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ نزع، فرقت اور سکیس کا کرب تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ میں مرا تو کبھی نہیں، لیکن میں نے دو آدمیوں کو نزع کی حالت میں ضرور دیکھا ہے۔ دونوں مختلف مقامات پر مختلف حالات میں مر رہے تھے، لیکن ان کی جان کنی کی کیفیت ایک سی تھی۔ پہلے شدید تشنج ہوتا تھا پھر ڈھیلے ہو جاتے تھے۔ پھر ان کے حلق سے آواز آنے لگتی تھی اور آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر خوف کی ایک لکیر کروٹیں بدل کر گزر جاتی تھی۔ پھر چار پانچ سیکنڈ تک وہ مکمّل سکون کی لپیٹ میں آجاتے اور اس کے بعد پھر وہی ڈرل شروع ہو جاتی۔ مرنے سے پندرہ بیس سیکنڈ پہلے ان کے چہروں پر طمانیت، سکون اور سپردگی کی کیفیت پیدا ہوتی۔ پھر جیسے لذّت حاصل کرتے وقت انسان "سی" کرتا ہے، وہ سارے کے سارے لذّت میں ڈوب گئے۔ گردن ذرا سی ہلی اور منکا ڈھلک گیا اور مجھے یوں لگا جیسے انسان خواب میں پہاڑ پر سے چھلانگ لگاتا ہے۔ انہوں نے بھی چھلانگیں لگا دیں۔

فرقت میں بھی آدمی کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے، لیکن وہ آخری اور لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ اس کے دل کے گرد اگرد سٹین لیس سٹیل کے بلیڈ کی نوک آہستگی سے پھرتی رہتی

ہے اور اس کا دل بند ڈبے کے اناناس کی قاشوں کی طرح کٹتا رہتا ہے۔ جب بلیڈ اُوپر سے لے کر نیچے تک سارے دل کی گول گول قاشیں کاٹ چکتا ہے، تو وہ قاشیں پھر جُڑ جاتی ہیں اور بلیڈ نئے سِرے سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس گھومتے ہوئے بلیڈ کو روکنے کے کئی عوامل ہیں۔ کچھ کارگر بھی ہیں اور بلیڈ کی گردش کو روک بھی دیتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کافی وقت گزر جانے کے بعد یہ بلیڈ پھر سے گھومنا شروع کر دیتا ہے جیسے سردیوں میں غلطی سے غلط بٹن دب جانے پر گرمیوں کا رُکا ہوا سیلنگ فین گھومنے لگتا ہے۔

جب ہم گلیشیئر کے قریب پہنچے، تو مزدور برف کے ڈھیلوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور گپیں لڑا رہے تھے۔ ہم اپنی اپنی چھڑیوں کی نوکیں برف میں گاڑتے گلیشئر سے گزرنے لگے۔ کٹے ہوئے بھربھرے راستے پر برف کرچ کرچ کر کے ہمارے پیروں تلے دب رہی تھی اور ہمارے تپے ہوئے پاؤں اندر ہی اندر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ یہ ٹھنڈک بڑی خوش آئند تھی۔ بھیگے ہوئے بالوں سے آنے والی ٹھنڈی ہَوا کی طرح۔ اُس میں تو دُوری کا احساس ہوتا ہے، لیکن اس میں پاؤں پڑنے کی کیفیت بھی تھی۔ ہم نے مزدوروں کو یک زبان سلام کیا اور اُن کے قریب سے گزرنے لگے۔ مُفتی برف پر گبھرا ہو کر چل رہا تھا اور اُسے ہر لمحہ پھسل جانے کا خوف لاحق تھا۔ مسعُود ماترے گنتا ہُوا جا رہا تھا۔ مَیں بے تالا تھا اور عمُر اور اعظمی نارمل انداز میں چل رہے تھے۔ ایک عمّاد کی حالت خراب تھی۔ ٹھنڈی ہَوا کی وجہ سے اُسے پھر اُبکائی آنے لگی تھی۔ برف کا ٹوٹا مشکل سے ڈھائی تین سو گز لمبا ہوگا، لیکن اُسے عبور کرنے میں اندازے سے زیادہ وقت لگا۔ گلیشئر ختم ہُوا تو مُفتی نے کمر سیدھی کر کے کہا ”اب لاؤ ذرا۔“

لیڈر نے فوراً کٹ کھول کر سُرخ گولیوں والی شیشی نکالی تو مُفتی بھلا اُٹھا۔ ”شیشی نہیں گدھے لیڈر، مجھے چائے چاہیئے۔“

اور ہم سب مل کر ”چائے چاہیئے، کون سی جناب“ گانے لگے۔ لیڈر نے سوٹی اُٹھا کر ہمارا کورس بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اعلان کرنے کے انداز میں بولا ”چائے وہاں مل سکے گی جہاں چشمہ ہوگا، پہاڑی کی اوٹ ہوگی، درختوں کی چھاؤں ہوگی اور سبزے کا ہموار ٹکڑا ہوگا۔“

"اور اگر"۔ مُفتی نے غصّے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ ساری چیزیں ایک جگہ نہ ملیں تو چائے بھی نہیں ملے گی"۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں"۔ لیڈر نے چہکار کر کہا۔ "یہ چیزیں نہ بھی ہوئیں تو بھی چائے ملے گی۔ تم چلو تو سہی"۔

عماد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں مُفتی جی، آپ چلیں تو سہی، دس قدم پر چشمہ مل جائے گا"۔

"چشمِ ماروشن بھی ملے گا اور دلِ شاد بھی"۔ اعظمی نے کہا۔

"دلشاد کون؟"۔ مسعود نے پوچھا۔

"وہی جو پشاور سے آزاد کشمیر ریڈیو پر گانے آیا کرتی تھی"۔ عماد نے جواب دیا۔

"یار، وہ دلشاد تو بڑی موٹی تھی"۔ عمر بولا۔ "یہ دوسری اچھی تھی لائلپور والی"۔

"لائلپور کی ساری دِل شادیں اچھی ہوتی ہیں بھائی"۔ اعظمی نے بیری کیپ ہاتھ پر جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یار اس دِل شاد کے ساتھ نظامی مرحوم نے بڑا اچھا لطیفہ کیا"۔ مسعود نے کہا تو لیڈر بولا۔ "اب آگے بھی چلو کہ یہیں رُکے رہو گے۔ راستہ لمبا ہے اور وقت کم ہے"۔

وقت کی کمی بھی انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ اگر وقت نہ ہوتا تو انسان کو کئی طرح کی اور تکلیفیں ضرور ہوتیں، لیکن وقت کی کمی کی کبھی شکایت نہ ہوتی۔ صمدانی صاحب اور ریحانہ کی محبت میں بھی وقت کی کمی حارج ہو گئی۔ وہ ایک بہت بڑے بنک کے زونل مینجر تھے اور ان کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ ریحانہ مشکل سے اٹھائیس انتیس برس کی ہو گی۔ بھرا بھرا بدن، ہلکی گندم گوں رنگت، کٹے ہوئے بال، ٹھوڑی کے عین درمیان چھوٹا سا تل۔ وہ ان کے بنک میں ایک ٹائپسٹ کی حیثیت سے آئی تھی اور اپنی خداداد لیاقت کی بنا پر جونیئر آفیسر ہو گئی تھی۔ اُس کو پتہ نہیں صمدانی صاحب کی کون سی بات پسند آئی جو اُن پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی۔ سہیلیوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ پارٹیوں میں جانا ختم کر دیا۔ کاغذوں پر توجہ دینا چھوڑ دی۔ صمدانی صاحب کا بڑا لڑکا لندن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے گیا تھا اور اسے گئے ہوئے

پورا ایک سال ہو گیا تھا۔ صمدانی صاحب ہر اتوار ریحانہ کو اپنی کار میں لے کر راول ڈیم جاتے تو انہیں اپنا بڑا لڑکا ضرور یاد آتا، لیکن وہ اس کے بارے میں کوئی بات نہ کرتے۔ وہ اپنی کار ڈیم کے پہلو میں کھڑی کر کے لمبی سیروں پر نکل جاتے اور ریحانہ سارے راستے ان کے بازو کے ساتھ لٹکتی جھولتی جاتی۔ جن جھاڑیوں میں پھول نہ بھی ہوتے ان میں بھی پھول نظر آتے۔ جن پتھروں میں چمک نہ بھی ہوتی ان میں بھی نیلم کی رگیں صاف نظر آتیں۔ جو راستے نہ ختم ہونے والے ہوتے وہ بھی ختم ہو جاتے۔ صمدانی صاحب کا ہر ملازم ان سے خوش تھا۔ ہر ماتحت ان کی مروت اور شفقت کے گن گاتا تھا۔ دو سال کی ان لمبی سیروں کے بعد اچانک ایک دن ایک لیفٹیننٹ سورڈ آف آنرز لے کر ان دونوں کے درمیان آ گیا اور ریحانہ نے اس کے کندھے پر انگلی پھیر کر پوچھا۔ "یہ پھول تین کب ہوں گے؟"

"آج سے پورے دو مہینے بعد"۔ لیفٹیننٹ نے جواب دیا اور وہ دونوں سکوٹر لے کر راول ڈیم چلے گئے۔ ہر شام راول ڈیم کی طرف جاتے ہوئے ریحانہ کو صمدانی صاحب ضرور یاد آتے، لیکن وہ ان کے بارے میں کوئی بات نہ کرتی۔ ڈیم کی چڑھائی پر سکوٹر ڈالتے ہوئے شاہد کو ریحانہ کا بازو اپنے سینے ہوئے پیٹ کے گرد ایک سانپ لگتا جو سردیوں میں حدت حاصل کرنے کے لئے کسی چیتے کے بدن سے لگ کر بیٹھ گیا ہو۔ ڈیم کے کنارے پہنچ کر ریحانہ کو سطح آب پر بہت سے بجرے، شکارے اور گنڈولے نظر آتے جن کے بندھے ہوئے پردوں کے درمیان مرد اور عورتیں گٹاریں اور رباب لے کر گا رہے ہوتے۔ گھاس پر نیم دراز ہو کر جب شاہد اس سے اپنے یونٹ کی باتیں کرتا تو ریحانہ کو یوں لگتا جیسے وہ جے جے دنتی کا الاپ کر رہا ہو۔ اس کی شخصیت کا سب سے خوبصورت حصہ فوجیوں کے خاص انداز کی حجامت تھا۔ ریحانہ اس کا محدود اربعہ انگلی سے متعین کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہا کرتی۔ "مجھے یہ بہت اچھی لگتی ہے — آپ لوگوں کی حجامت"۔

ایک شام جب صمدانی صاحب ریحانہ کے گھر گئے تو اس نے بڑی خوشی کے ساتھ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ صمدانی صاحب کی عمر اب پچاس سے بہت اوپر نکل گئی تھی۔ انہوں نے گھر کے اندر کھلنے والے دروازے

کی طرف دیکھ کر کہا" ریحانہ، اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میں تمہارے صحن خانہ کی وہ دھوپ ہوں جو زمین سے اٹھ کر اونچی دیواروں پر پہنچ چکی ہے۔ ابھی یہ ممٹی پر آئے گی اور پھر اندھیرا پھیل جائے گا۔ مجھے آرام سے ممٹی پر پہنچ لینے دو"۔۔۔ ریحانہ نے سر جھکا کر کہا۔" ہاں سر، وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ بہت ہی کم۔ میرے لئے تو آپ سے بھی زیادہ کم رہ گیا ہے۔"

ہمدانی صاحب کی آنکھوں میں اس اقرار سے خوشی کے جگنو چمکے اور ان کی عمر پچاس سے بہت نیچے پہنچ گئی۔

"پھر ریحانہ"۔۔۔ انہوں نے گلا صاف کر کے کہا۔" مجھے اپنی محبت، قرب اور اپنے ساتھ کے چند مہینے اور عطا کرو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔"

ریحانہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اتر آئے اور اس نے سر جھکا کر کہا۔" میں نے کہا ناں سر، کہ وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے اور ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔ اب مجھے جانے دیں۔"

کوئی دس سیکنڈ تک کمرے میں خاموشی رہی پھر ریحانہ نے دھیمی آواز میں کہا۔" دراصل سر! ہر لڑکی کے لیے شادی کا ایک وقت ہوتا ہے اور جب وہ گزر جائے تو پھر وہ لڑکی ساری عمر ایسے ہی رہ جاتی ہے۔ میرا وقت بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ مجھے جانے ہی دیں۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور قالین پر ہمدانی صاحب کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ روتی ہوئی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

وقت کم تھا۔ جھیل دور تھی اور ہمیں ہر حال میں سہ پہر سے پہلے پہلے وہاں پہنچنا تھا۔ راستے میں کھانا کھانے اور چائے پینے کے لیے ایک گھنٹے کی بریک لازمی تھی۔

لیڈر سوٹی گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔" جلدی کرو، جلدی کرو۔ ہمت سے کام لو۔ وقت کم ہے اور ہمیں دور پہنچنا ہے۔"

"شاباش شاباش میرے جواں ہمت ساتھیو شاباش"۔ مسعود بار بار نعرے لگا رہا